ماہنامہ
رائے بریلی

پیام عرفات

آزادی کیا ہے؟!

''وہ آزادی آزادی ہی نہیں جس کا سایہ ملک کے ایک حصہ پر پڑے اور دوسرا حصہ محروم رہے۔ ایک فرقے کے حق میں آزادی کی بہار آئے اور اس کا باغ نئے برگ وبار لائے اور دوسری جگہ خزاں کا دور دورہ ہو اور نئے نئے علمی اور ذہنی، تعلیمی وتربیتی اور مذہبی واعتقادی طوق وسلاسل اور رکاوٹوں اور پابندیوں کا منظر!''

(ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ:۱۶)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مركز الإمام أبي الحسن الندوي
دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

راہِ نجات

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ

''قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتوں پر مستحکم یقین اور اس یقین کے مطابق عمل اور کامیابی کے لیے مسلسل جدوجہد، سعی ومحنت اور اس راہ میں جو تکلیف ومصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا۔ زمانہ کی اصطلاحیں بدلتی رہیں گی لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں۔ اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ''ایمان'' اس کے مطابق عمل کا نام ''عمل صالح'' اور مسلسل جدوجہد اور سعی ومحنت کا نام ''جہاد'' اور اس کے لیے پامردی کا نام ''صبر وثبات'' ہے۔ دنیا میں جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنے قومی وسیاسی ایمان کے لیے کون سی چند حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ کون سی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہیں؟

مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی وسیاسی کوششوں کا محور قرار پائے تو ان کا یہ جذبہ کہاں تک ان کو اونچا لے جا سکتا ہے اور ان کی سعی ومحنت، جدوجہد اور جوش وخروش کو کب تک قائم رکھ سکتا ہے؟ جو طوفان اور سیلاب دم کے دم میں آتا ہے، وہ اسی طرح دم کے دم میں چلا بھی جاتا ہے۔

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے۔ وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے۔ اس کے مذہبی وسیاسی واقتصادی واجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شراب خوری، قمار بازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی واقتصادی نظام قائم کرنا، اس کے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلمان اس کے لیے دنیا میں کٹ مر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ جس کے لیے وہ آج کٹ مر رہے ہیں وہ عین اسلام ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اسلامی نظام کی جھلک ہے۔ اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی واقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں۔

آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے ـــــــ دنیا اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے حالانکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے ''اسلام ازم'' لیکن وہ اسلام نہیں جو آج عملاً مسلمانوں میں ہے بلکہ وہ جو قرآن وسنت میں ہے۔ آج کی وہ کون سی شکلیں ہیں جن کا حل ان میں نہیں؟ ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے۔'' (معارف؛ جنوری ۱۹۳۹ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۶ | صفر المظفر ۱۴۴۶ھ - اگست ۲۰۲۴ء | شمارہ: ۸

قیامت کی ایک نشانی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلٰى غَيْرِ أَهْلِهَا فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(جب امور (حکومت) نااہل لوگوں کے سپرد کردی جائے تو

قیامت کا انتظار کرو۔)

(صحیح البخاری: ۵۹)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15

E-Mail: markazulimam@gmail.com

سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

ملک کی آزادی کے لیے خطرہ کی گھنٹی (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں.....۴

.....حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

سنتِ الٰہیہ.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

سورۂ ماعون-مکمل دین کا تصور پیش کرنے والی ایک سورہ.....۸

.....حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

مدارس؛ اندیشے، تبصرے اور تجویزیں.....۹

.....مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

تقویٰ کیا ہے؟.....۱۱

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

طلاق کے چند مسائل.....۱۳

.....مفتی راشد حسین ندوی

کتمان آیات کا وبال.....۱۵

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی مدنی

آزادیٔ ہند-حقیقت یا سراب.....۱۷

.....مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی

آزادیٔ ہند-ایک لمحہ فکریہ.....۱۹

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

یہ داستان عشق مگر مختصر نہیں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ

اس راز کی کسی کو بھی مطلق خبر نہیں
دل رو رہا ہے میرا مگر آنکھ تر نہیں

غیروں پہ تیری جاتی ہے کس واسطے نظر
واللہ! ان کے ہاتھ میں نفع وضرر نہیں

جب میں ہوں ان کے ذکر کی دولت سے مالا مال
کیوں غم ہو اپنے پاس جو لعل وگہر نہیں

تسکین خود وہ آکے مجھے دے رہے ہیں آج
صد شکر ہے کہ آہ مری بے اثر نہیں

ہم ہیں مریض عشق، نہ ہوگی ہمیں شفا
تدبیر کوئی بس میں ترے چارہ گر نہیں

سننا ہے آپ کو تو سنیں شوق سے جناب
یہ داستان عشق مگر مختصر نہیں

اتنا تو ہوش ہے کہ مرے سامنے ہیں وہ
اس کے سوا مجھے کسی شے کی خبر نہیں

الفت میں ان کی اپنے کو جس نے بھلا دیا
دونوں جہاں میں پھر اسے خوف وخطر نہیں

احمدؔ کسی کے عشق میں دیوانہ ہوگیا
وہ بے خبر بھی ہوکے مگر بے خبر نہیں

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ملک کی آزادی کے لیے خطرہ کی گھنٹی

اس ملک کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، ہر ایک کو پھلنے پھولنے کے مواقع یہاں حاصل ہوئے ہیں، آزادی کی لڑائی ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ملک میں جنگ آزادی کا صور پھونکنے والے مسلمان ہی تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے سب سے پہلے اس کا فتویٰ دیا اور حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ نے سب سے پہلے عملی اقدام کیا، راجہ ہندوراؤ، وزیر گوالیار کے نام سید صاحبؒ کا خط اس کی ایک اہم یادگار ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ''جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاج دار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے، بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور عزت وحرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت وسیاست کے مرد میداں تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لیے مجبوراً چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔''

ریشمی رومال کی تحریک ہو یا شاملی کے میدان کی جاں بازیاں، اس کی قیادت کرنے والے علماء ومشائخ تھے، گاندھی جی کو گوشۂ تنہائی سے نکال کر قیادت کے منصب پر مولانا محمد علی جوہرؒ نے بٹھایا، ملک کی آزادی کی یہ ایک پوری تاریخ ہے، لیکن برطانیہ نے اپنا سامراج لپیٹتے لپیٹتے بھی اپنی ایسی بدنما یادگاریں چھوڑیں جنھوں نے ملک کی شبیہ داغ دار کر دی، ملک کی سنسکرتی اور روایات کو گندہ کر گئے، ایک انگریز مصنف اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے ایسی تاریخ تیار کر دی ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی مل نہیں سکتے۔ اس کا سب سے پہلا مظاہرہ تقسیم ملک کے موقع پر بہت ہی گھناؤنی شکل میں ہوا، عورتوں اور بچوں کو زندہ کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب ان لوگوں نے کیا جنھوں نے مل کر ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دی تھیں اور اس کے لیے لاکھوں نہیں کروڑوں جانیں نذر ہوئی تھیں۔

اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ملک میں ایسی گھناؤنی ذہنیت رکھنے والا طبقہ نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ پنپ رہا ہے اور یہ چیز ملک کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتی جا رہی ہے کہ اس طبقہ کی ہمت افزائی ان لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے جو لوگ ملک کی سالمیت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے صرف ۷۵ رسال کا عرصہ گزرا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ دوبارہ غلامی کی طرف جا رہا ہے، ملک کا اعلیٰ دماغ دوسروں کے کاز کے لیے استعمال ہو رہا ہے، سات سمندر پار سے یہاں کی پالیسیاں طے کی جا رہی ہیں اور اس قوم سے اس سلسلہ میں مشورے کیے جا رہے ہیں جس نے اس ملک کو تباہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے، یہودی پروٹوکول (Protocol) میں یہ حقائق موجود ہیں، کیا اس سے اس ملک کے لیے کسی بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کا خون پیا ہے؟ یہ صورت حال ملک کے لیے بے حد خطرناک ہے!

ملک کے باشندوں کو مساویانہ شہری حقوق حاصل ہیں، یہاں کے قانون میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے، لیکن جس طرح یہاں کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ برتاؤ کیا جا رہا ہے اور خاص طور پر الکٹرانک میڈیا یہاں کا ذہن مسموم کرتا رہا ہے، یہ یہاں کی پوری فضا کو زہر آلود کر دینے کے لیے کافی ہے، پھر مسئلہ صرف ایک قوم کا نہیں رہ جائے گا پورا ملک خطرہ میں پڑ جائے گا، کسی بھی ملک کے لیے یہ نہایت خطرناک صورت حال ہے کہ وہاں کی آبادی حصوں میں تقسیم ہو جائے اور محاذ آرائی شروع ہو جائے، پھر ملک کی ساری صلاحیتیں ضائع ہونے لگتی ہیں اور ترقی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گذر رہے ہیں۔ یہاں ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لیے ایک بڑی پرعزم لیکن دانش مندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہاں مسلمانوں کے ملی وجود، ان کی اجتماعی شخصیت وانفرادیت کی بقا کے لیے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت سے رہیں، محفوظ ہوں، باعزت ہوں، مؤثر اور فیصلہ کن ہوں، حالات وواقعات سے عہدہ برآ ہوسکیں، زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلہ کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔

ہندوستانی مسلمان ساری سیاسی تبدیلیوں اور معاشی انقلاب کے باوجود اب بھی اتنے سرمایہ کے مالک ہیں کہ یہاں احیاء وبقائے اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی ہر تحریک اور یہاں کے مرکزی دینی وتعلیمی ادارے بخوبی چل سکتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے ان کو مالی بحران سے دوچار ہونے، دوسرے ملکوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اپنے اصلاحی وتعمیری پروگرام میں اختصار یا التواء کی ضرورت ہے لیکن کتنی تحریکیں ہیں جن کی کامیابی کے بغیر مستقبل میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہ ہوگا کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

کتنے مرکز ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو ذہنی تہذیبی ارتداد سے (جو سیلاب کی طرح آرہا ہے) بچانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ نوجوانوں کے ذہن میں اسلام اور اس کے مستقبل پر اعتماد (جس کو مغربی تعلیم وافکار نے متزلزل کردیا ہے) بحال کرسکتے ہیں۔ مستشرقین مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کے لیے (جو ان سب دماغوں کو مسموم کررہا ہے جن کے ہاتھ میں مسلم ممالک کی قیادت ہے) تریاق مہیا کرسکتے ہیں۔ کتنے مرکز ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابدی قانون اور زندگی کے رواں دواں قافلے کے درمیان رفاقت ومطابقت پیدا کرسکتے ہیں اور اس طبقہ کو جو واقعات وحقائق سے دوچار ہے، نئی رہنمائی، نیا اعتماد اور نیا ایمان عطا کرسکتے ہیں اور اس کام کو دوبارہ جاری کرسکتے ہیں جو متکلمین اسلام نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا۔ کتنے افراد اور ادارے ہیں جو مغربی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی بولیوں میں اسلام اور قرآن وسیرت نبویؐ کا تعارف کراسکتے ہیں اور ان سب سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں جو حق کی جویا اور جمال جہاں آراء نبوی کی نادیدہ عاشق ہیں۔ زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی حفاظت وتربیت کے لیے کتنے منصوبے ہیں جو ان کو الحاد وفساد کا لقمہ تر بننے سے بچاسکتے ہیں اور ان کے اندر ایمان کی چنگاری کی حفاظت کرسکتے ہیں لیکن یہ سب تحریکیں اور ادارے یا تو وسائل کے فقدان کی وجہ سے ایک خواب شیریں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یا اگر کہیں وجود میں آگئے ہیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹمارہے ہیں۔

دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کسی ملک میں پندرہ کروڑ کی ایک اقلیت پائی جاتی ہو جن میں لاکھوں کی تعداد میں بڑے سرمایہ دار اور لاکھوں کی تعداد میں بڑے تعلیم یافتہ حضرات موجود ہوں، سیاسی حالات اور پچھلی تاریخ نے اس کے گرد تعصّبات اور غلط فہمیوں کا جال پھیلا دیا ہو، سیاسی جماعتوں کی مصلحتوں اور تنگ نظر فرقہ پرستی نے اس کو کوہِ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کردیا ہو، ہر وقت اس کے متعلق بڑی سے بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان ہو۔ وہ اگر مظلوم ومعصوم ہو تو اس کو ظالم وخونخوار ثابت کرنا، وہ اگر اپنی حفاظت خود اختیاری کا فرض

بھی انجام نہ دے تب بھی اس کو دست درازی اور لشکر کشی کا مجرم ٹھہرانا، وہ اگر مقتول ہو تو اس کو قاتل گردانا آسان ہو۔ اس کا مخالف پریس ہر وقت رائی کو پربت اور افسانے کو حقیقت بنا سکے لیکن اس سب کے باوجود اس ملت کے پاس کوئی طاقتور پریس نہ ہو، اس برعظیم کے طول وعرض میں اس کا ایک بھی انگریزی روزنامہ نہ ہو، ہندی میں اس کی آواز پہنچانی مشکل ہو۔ ملک کے ذمہ دار صاحب اختیار حلقے اور ارباب حکومت تک (ان کی مانوس زبان میں) حرف شکایت تک پہنچانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ممکن نہ ہو، لیکن ہر طریقہ سے اس ملت کی خوش حالی کا اظہار ہوتا اور معاشی منصوبوں سے لے کر دینی شعبوں اور خیراتی کاموں تک وہ اپنی زندگی اور الوالعزمی کا ثبوت دیتی رہتی ہو، دینی جذبہ اور سیاسی شعور سے قطع نظر اس ملت کی عقل عام (commen sense) کے متعلق کیا کہا جائے گا۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

پھر اس ملت کو کسی دوسرے فرقے، کسی جماعت یا حکومت کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے اور کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر چیں بہ جبیں ہونے کا کیا موقع ہے؟ ملک کے کسی گوشہ میں فرقہ وارانہ فساد کا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس پر تو جتنی توجہ کی جائے کم ہے، مظلوم ومتاثر مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد نہ صرف دینی بلکہ اخلاقی وانسانی فرض ہے، مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی اگر اس فساد زدہ علاقہ کی مدد کریں تو بے جا نہیں۔ فساد زدہ علاقوں کے لیے ہندوستانی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض اور احساس فرض کی معمولی مثال ہے جس پر کوئی تعجب ہونا نہیں چاہیے، جو کچھ ہوا وہ کم ہے، اس سے بھی زیادہ حمیتِ دینی اور ایثار وقربانی کی ضرورت ہے لیکن یہ بات اس وقت خواہ کیسی بھی سمجھی جائے بہر حال حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ اندیشہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں کی مدد کہیں خدانخواستہ ایک ''سالانہ عرس'' نہ بن جائے جس میں مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں مصروف ہو کر رہ جائیں۔

یہ مسلمہ حقیقت اور عالم گیر صداقت ہے کہ اقلیت کو عزت کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے اکثریت کے مقابلہ میں دوگونہ بلکہ چہار گونہ محنت اور جاں فشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی اصول پر (ناگواری اور مجبوری کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) یہودیوں نے امریکہ میں اور بیشتر مغربی ممالک میں اپنی زندگی' صلاحیت اور مشکل پسندی کا ثبوت دیا اور اس نے ملک وحکومت میں وہ اثر ونفوذ حاصل کر لیا جس کا اس کے عددی تناسب کے ساتھ کوئی میل نہ تھا۔

لیکن شاید ہندوستان واحد ملک ہے جہاں مسلمان اقلیت' اکثریت کے مقابلہ میں دوگونہ اور سہ گونہ محنت کے بجائے برابر کی محنت بھی نہیں کرتی اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہ مقابلہ کے امتحانوں میں امتیاز حاصل کرنے اور بڑے اور ذمہ دارانہ عہدوں میں حصہ پانے سے محروم ہوتی جارہی ہے اور اگر یہی لیل ونہار رہے تو اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پس ماندہ اور اچھوت اقوام کی صف میں آجائے یا اس سے بھی پچھڑ جائے جو بڑی تشویش اور فکر کی بات ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے اور اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اس کی کشتی حیات ڈانوا ڈول ہو رہی ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت وضرورت اور بے لاگ وبے غرض دعوت وقیادت کے بغیر عزت واطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اقبال نے صحیح کہا ہے کہ

زندگی جہد است استحقاق نیست

اور سب سے بڑھ کر قرآن مجید کا واضح اعلان ہے: ''بس جھاگ تو بیکار جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے اللہ ایسے ہی مثالیں بیان فرماتا رہتا ہے۔''

(خلاصہ از: مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں: ۳۳-۴۶)

سنتِ الٰہیہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کی تخلیق سے قبل ہی اس کا پورا نظام طے کر دیا تھا اور اسی وقت یہ فیصلہ بھی کر دیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے؛ حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے میدان اور مواقع الگ الگ ہوں گے۔ لہٰذا پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل کو خوب نوازا اور بڑی ذمہ داریاں دیں، پھر ان کے اعمال کا جائزہ بھی لیا اور ان کے ذریعہ یہ دکھا دیا کہ انسان کی نیکی اعلیٰ مقام تک لے جا سکتی ہے، حتی کہ انسان کو مقام نبوت وولایت بھی حاصل ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کی برائی یہاں تک لے جا سکتی ہے کہ وہ بندر اور خنزیر بنا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نسل کو نیک اعمال اور اپنا مقام بلند کرنے کا پورا موقع عطا فرمایا اور انہیں ایک لمبا دور اور بے شمار مواقع بھی دیے، تا کہ جب قیامت کے دن ان کا حساب وکتاب ہو، تو کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ تمہیں جو مواقع دیے گئے، تم نے ان کا استعمال نہیں کیا، بلکہ پورا معاملہ بالکل الٹ کر رکھ دیا، اس لیے اب تم سزا کے مستحق ہو۔

ملک شام میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے جو بنی اسرائیل تھے آباد تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک عرصہ تک ان کی نسل میں نبوت کی دولت اور اس کا جو اعزاز باقی رکھا، اسی کی وجہ تھی کہ ان میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے اور اللہ کی کتابیں نازل ہوئیں، اس کے علاوہ بے شمار اللہ کے ولی اور بزرگ بھی پیدا ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ ان کے اندر بہت سے ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو محض حق بات کا انکار کرنے کی حد تک شر پسند نہ تھے، بلکہ ان کے اندر دین کو نقصان پہنچانے اور انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے کے عناصر بھی موجود تھے۔ گویا بنی اسرائیل کے اندر اللہ تعالیٰ نے دونوں طرح کے نمونے دکھا کر ایک مثال قائم کر دی کہ جب انسان بلند ہوتا ہے تو کتنی بلندی تک جاتا ہے اور جب انسان گرتا ہے تو کس حد تک گرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ علیہم السلام کی مثالیں بیان کی ہیں، جن کی زندگی گویا معجزات میں سے تھی اور ان کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ بہت ہی اعزاز واکرام کا ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسی مثالیں بھی نظر آتی ہیں، جن کو دیکھ کر آدمی حیرت میں پڑ جائے کہ ایک شریف اور باعزت خاندان میں ایسے شر پسند لوگ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو ذمہ داری حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں رکھی تھی، جب وہ لوگ نا اہل ثابت ہوئے تو یہ فیصلہ ہوا کہ اب یہ ذمہ داری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں چلے گی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا علاقہ وہ تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ ہی سے اللہ کے یہاں مرکز قرار پا گیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام نے وہاں قیام بھی کیا تھا، لیکن اس مقام کو اللہ تعالیٰ نے ایک عرصہ تک خالی اور غیر آباد رکھا، البتہ جب اس نسل پر اللہ کا انعام ہوا تو ان کی اولاد میں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے اور ان کے بعد بڑے بڑے اولیاء اور بزرگ بھی پیدا ہوئے، اس لیے کہ خاتم النبیین محمد ﷺ کے بعد اسی طبقہ کو دین کی ذمہ داری سنبھالنا تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس نسل میں حضور ﷺ کے بعد سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو مآل وخصوصیات اور اپنی کارکردگی کے لحاظ سے انبیاء کی سطح کے معلوم ہوتے ہیں، دنیا انہیں مجدد یا دوسرے ناموں سے یاد کرتی ہے، معلوم ہوا کہ حضرت اسماعیل کی نسل نے اچھا ثبوت پیش کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو جزیرۃ العرب کے خاندان قریش میں مبعوث کیا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے، اسی لیے آپ کے اولین مخاطب کفار مکہ تھے، اس وقت کی صحیح صورت حال کو جاننے کے لیے مخاطَب اور مخاطِب دونوں کے احوال کا علم ضروری ہے، سیرت وتاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ اس وقت عرب انتہائی جاہلیت اور ناواقفیت میں تھے، حتی کہ اپنے محلّہ یا اپنے

شہر کے باہر سے بھی ناواقف تھے اور ان کا سارا وقت شعر وشاعری سے لطف لینے اور اس پر فخر کرنے میں ہی صرف ہوتا تھا، گویا ان کی زندگی کا پورا نظام فخر اور شان دکھا کر چلتا تھا، لیکن اس کے علاوہ دنیا یا دین کی انہیں کچھ معلومات نہیں تھیں، گرچہ ان کے چاروں طرف ایسی قومیں موجود تھیں جو علم میں بہت فائق تھیں۔

آپ ﷺ جاہلی عرب امت میں سے تھے، آپ ﷺ نے کہیں علم حاصل نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان مراحل سے گذرے تھے جن کا بنی اسرائیل کے یہاں اشارہ ملتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بہت اعلیٰ قسم کی طبیعت عطا فرمائی تھی، جس کے ذریعہ خود بخود نیکی کا ایسا رجحان پیدا ہو جو اچھے سے اچھے لوگوں میں نہیں پایا جاتا اور یہی وہ طبیعت تھی جس کی بنیاد پر آپ ﷺ بعثت سے قبل ہی سماج کے اندر ایک خلا محسوس کرنے لگے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر آدمی کی طبیعت اچھی ہو اور سماج میں دینی جذبہ نہ ہو تو اسے فطری طور پر ایک خلا محسوس ہوتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہماری تخلیق کا مقصد کیا ہے اور یہ کائنات کیوں بنائی گئی ہے؟ اور یہی وہ احتساب کا جذبہ ہے جو انسان کی ترقیات کا بڑا راز ہے، جب انسان کے اندر یہ جذبہ ہوتا ہے تو وہ بہت ترقی کرتا ہے، لیکن عرب کی جاہل امت میں یہ جذبہ سرے سے مفقود تھا اور اس کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی، بلکہ ان کی حالت بہت سطحی تھی اور اس جذبہ کے بالکل برخلاف تھی، ان کی زندگی کا ماحصل کبر ونخوت اور فخر وغرور تھا اور یہی ان کی کل جاہلی طبیعت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو ایسے سماج سے کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی اور آپ امی ہونے کے سبب دشوار گذار مراحل سے ناواقف تھے، اسی لیے آپ ﷺ کو قرآن مجید میں جا بجا تسلی آمیز کلمات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

﴿یٰسٓ ☆ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ☆ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾

(یٰسٓ، قرآن حکیم کی قسم، یقیناً آپ رسولوں ہی میں سے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے سورۂ یس میں ''یٰس'' یعنی آپ ﷺ کی قسم کے بعد قرآن مجید کی قسم کھا کر آپ ﷺ کو تسلی دی، قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا واسطہ دیا گیا، یعنی اگر تم قرآن حکیم کو مانتے ہو اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہو تو ہماری یہ بات بھی تم اچھی طرح سمجھو اور مان لو کہ بلاشبہ تم مرسلین میں سے ہو اور مرسلین سے مراد اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی سے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم آپ کو ذمہ داری دے کر ایک اہم کام پر بھیج رہے ہیں اور وہ اہم کام انسانوں کو زندگی گذارنے کے لیے سیدھا راستہ بتانا ہے۔

﴿عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ☆ تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ﴾ (یٰس: ٤-٥) (سیدھی راہ پر ہیں، (یہ قرآن) اس ذات کی طرف سے اتارا جارہا ہے جو زبردست بھی ہے، رحم فرمانے والا بھی ہے)

اللہ تعالیٰ نے آیت میں نبی ﷺ کو جس سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کا حکم دیا، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ اس راستہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانوں کا ایجاد کردہ راستہ نہیں ہے، یعنی اگر انسان یہ سمجھے کہ فلاں بہت بڑا شاعر ہے، اس کی بات بہت اہم اور وزنی ہے، لہٰذا اگر وہ کسی راستہ کی رہنمائی کرے تو بھی درست ہوگا، اس آیت سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ایسا ممکن نہیں ہے بلکہ اس راستہ کو اس ذات نے طے کیا ہے جو عزیز ورحیم ہے، یعنی وہ ذات غالب ہے اور اس کو ہر چیز پر قابو ہے نیز وہ ذات رحم والی ہے، معلوم ہوا انسانوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ رحم والا ہے، یعنی اگر انسان اچھا بنے، فائدہ والا بنے تو اس کو زندگی کی رحمت حاصل ہوگی۔

﴿لِتُنذِرَ قَوْماً مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ﴾ (یٰس: ٦) (تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کریں جن کے باپ دادا کو خبردار نہیں کیا گیا تو وہ غفلت میں پڑے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنایا اور اس سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کی جو انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، لیکن اس اعزاز واہمیت کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ ان لوگوں کو ڈرائیں، جن کے باپ دادا تک کو ڈرایا نہیں گیا تھا اور یہ بتائیں کہ تم اپنے آپ کو ضائع مت کرو، تم حد سے زیادہ آرام میں مست مت رہو، بلکہ کوئی خدمت انجام دو اور اپنے طرز زندگی سے متعلق غور کرو۔

سورۂ ماعون مکمل دین کا تصور پیش کرنے والی ایک سورہ

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

سورۂ ماعون سات چھوٹی آیتوں پر مشتمل ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ مکی سورہ ہے یا مدنی، بعض کا خیال ہے کہ ابتدائی تین آیتیں مکی ہیں اور بقیہ آیات مدنی۔ حقیقت میں یہ سورت مکی زندگی اور مدنی زندگی دونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مکی زندگی عقیدہ کی ترسیخ کی زندگی ہے اور مدنی زندگی عبادت اور سلوک کی تشکیل اور تربیت کی زندگی ہے اور اسلام عقیدہ، عبادت اور سلوک تینوں شعبوں پر مشتمل ہے اور تینوں شعبوں میں اخلاص اور للّٰہیت کا طالب ہے۔ عقیدہ اور عبادت میں اخلاص تو مذہب کی روح ہے۔ اسلام اجتماعی زندگی میں بھی اور انفرادی زندگی میں بھی ہر کام کو اللہ کے لیے اور آخرت کے تصور سے جزا اور ثواب کے خیال سے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس طرح یہ سورت مختصر ہونے کے باوجود ایمان، عبادت، اخلاق اور خدا کی قدرت کے استحضار کی تلقین کرتی ہے۔ شکلی طور پر عبادت کرنے والوں کو جو غفلت یا دکھاوے کے لیے عبادت کرتے ہیں اس میں متنبہ کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر عبادت حقیقی ہو اور اس میں ایمان پایا جاتا ہو اور خدا کا استحضار ہو تو وہ عبادت زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور اچھے اعمال کی طرف راغب کرتی ہے اور برے اعمال سے بچاتی ہے۔ اس طرح آخرت کا یقین انسان کو اچھے اعمال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

اس سورت سے مسلم سماج کی صحیح تصویر بھی سامنے آجاتی ہے جس میں ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے۔ یتیموں، محتاجوں، غریبوں کی صرف مدد ہی نہیں کی جاتی بلکہ اس کی تلقین کی جاتی ہے۔ اوقاتِ عبادت کی فکر کی جاتی ہے اور اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مظاہرے اور ریا سے گریز کیا جاتا ہے اور ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی ہے۔ سورت میں الفاظ کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں صرف ترغیبی نہیں ہیں بلکہ دین کا جزء ہیں اور ایمان کا نتیجہ۔

اس مفہوم کو جو اس سورت میں بہت اختصار اور ایجاز کے ساتھ بیان کیا گیا، دوسرے مواقع پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے ایک وسیع مفہوم کو جس کا دائرہ اقرار باللسان، تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان، انفرادی اور اجتماعی اخلاق و معاملات پر محیط ہے، اختصار کے ساتھ بیان کیا اور اس کے ساتھ ترغیب اور تشکیل ذہنی کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کیا جو اس تصور کو ذہن میں مصور کر دیتے ہیں۔ استفہام کا اسلوب بیان میں جمال اور تاکید میں اضافہ کرتا ہے۔

اس سورت میں اس بات کا بھی بیان ہے کہ اسلام ایک جامع اور کامل دین ہے، وہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اس میں ہر شعبہ دوسرے شعبے سے جڑا ہوا ہے، وہ سماج سے علیحدگی اور زندگی سے انقطاع کا مذہب نہیں ہے۔ ظاہر ہے یتیم اور مسکین کی مدد اور ضرورت مند کے تعاون پر وہی قادر ہو سکتا ہے جس کے پاس اس کے وسائل مہیا ہوں۔ اس لحاظ سے یہ سورت مکمل دین کا تصور پیش کرتی ہے جس میں دین اور دنیا کے درمیان متوازن رشتہ قائم ہو۔

اس زمانہ میں جب کہ مذہب کے بارے میں یہ تصور دیا جاتا ہے کہ وہ انفرادی معاملہ ہے، اسلام کی اجتماعی تعلیمات کا پیش کرنا اور انسانیت کے مسائل حل کرنے میں اسلام کا جو اہم کردار ہے اس کو پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مدارس: اندیشے، تبصرے اور تجویزیں

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

ادھر کچھ عرصہ سے مدارس، مدارس کے نظام، مدارس کے نصاب، مدارس کے طلبہ اور ان طلبہ کے مستقبل کے سلسلہ میں مختلف تبصرے، اندیشے اور تجویزیں سامنے آرہی ہیں۔ اندیشوں کی وجہ کچھ تو مدرسوں سے ناواقفیت ہے اور کچھ دینی تعلیم سے بے اعتنائی بلکہ بیزاری ہے، چنانچہ کچھ لوگ مدارس کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھ کر اس تعلیم سے وابستہ افراد کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، ان میں کچھ اپنے بھی ہیں اور کچھ پرائے بھی، غیروں کا تو خیال یہ ہے کہ مدرسے دہشت گردی کا اڈہ ہیں، ملک کی سالمیت اور یکجہتی کے لیے ایک بڑا خطرہ ہیں، کردار سازی کے بجائے ہتھیار سازی کا یہاں کام ہوتا ہے، اخلاقی تربیت کے بجائے یہاں فوجی تربیت کا نظم کیا جاتا ہے، ہندوؤں کے خلاف نفرت کا یہاں بیج بویا جاتا ہے، ملک سے غداری کرنے کا سبق یہاں پڑھایا جاتا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مدرسہ سے فارغ ہونے والی اس مختصر سی تعداد کے مستقبل کی تو زمانے کو اتنی فکر ہے، لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں نوجوانوں کی بے روزگاری پر نہ کوئی دل تڑپتا ہے اور نہ کسی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ہے۔

افسوس کہ ہم میں سے کچھ سَر پھرے بھی ان کے سُر میں سُر ملانے کی کوشش کرتے ہیں، گلے گلے میں فرق ہوتا ہے، چنانچہ سُر تھوڑی بدل جاتے ہیں، لیکن کچھ فرق کے ساتھ اثر اپنا وہی دکھاتے ہیں اور مدارس کے بارے میں بدگمانی پھیلانے میں مخالفین کا ساتھ دیتے ہیں، اپنوں کا کہنا یہ ہے کہ مدرسوں میں مسلمان بچوں کی ایک بڑی تعداد کو ناکارہ بنایا جارہا ہے، ان کو ایک اندھیرے مستقبل کی طرف ڈھکیلا جارہا ہے، مدرسوں کے فارغین کے لیے کام کا کوئی میدان نہیں ہے اور روزی کمانے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

لیکن حقیقت کیا ہے؟ آیئے اس حقیقت کی تلاش میں کچھ آگے بڑھتے ہیں، مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ کا مقصد کیا ہے؟ مدرسہ سے فارغ ہونے والوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ مدرسے کے اس فائدہ سے قطع نظر کہ ان مدرسوں کی بدولت مسلم معاشرہ کا وہ طبقہ اپنا مستقبل سنوارنے میں کامیاب ہوجاتا ہے جو مدرسہ نہ ہونے کی صورت میں تعلیم سے محروم ہوجاتا، نہ وہ اسکولوں کی فیس دے سکتا تھا، نہ کورس کی کتابیں خرید سکتا تھا، نہ ناشتے اور کھانے کا معقول انتظام کرسکتا تھا اور نہ رہائش کے ساتھ لحاف اور گدوں کا بوجھ اٹھا سکتا تھا، وہ تو دعا دیجیے مدرسہ کے ذمہ داروں کو کہ انہوں نے مسلم بچوں اور نوجوانوں کو سماج پر بوجھ بننے سے بچالیا، مدرسہ میں تعلیم حاصل کرکے کم سے کم وہ اس لائق تو ہو ہی جاتے ہیں کہ اپنے لیے ترقی کی راہیں تلاش کرسکیں اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے اپنے لیے ایک روشن اور تابناک مستقبل کی تعمیر کرسکیں، مدرسہ کے دوسرے تمام فوائد کو نظر انداز کرکے اگر صرف اسی ایک پہلو کو لیا جائے تو مدرسے کی ضرورت، مہنگائی کے اس دور میں اور تعلیم کے کاروبار بن جانے کے نتیجہ میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

لیکن مدرسہ کے قیام کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کو صرف ذریعہ معاش کے طور پر استعمال کیا جائے، مدرسہ کا مقصد اس سے کہیں زیادہ بلند، وسیع اور پاکیزہ ہے۔

مدرسہ کی اہمیت کی گواہی اگر اس شخص کی زبانی ہو جو عصری تعلیم گاہوں کے لیے سرمایہ افتخار ہو، جس کے علم وادب کے آگے دنیا جھکتی ہو، جس نے مغربی دانش کدوں میں اپنی زندگی کے سالہا

سال بتائے ہوں، جس نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی صرف داستان ہی نہ سنی ہو بلکہ ان کے آثار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا ہو، جو تاریخ سے نہ صرف واقفیت رکھتا ہو بلکہ تاریخ سے نتائج نکالنے کا ہنر بھی جانتا ہو، زوال کے اسباب پر جس کی نظر ہو، عروج کی تمنا جس کے دل میں ایک شعلے کی طرح دہک رہی ہو، جس کا ایک ایک لمحہ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر کرب میں گزر رہا ہو، جس نے نہ مدرسہ میں پڑھا ہو اور نہ ہی مدرسہ میں پڑھایا ہو، لیکن اس کے باوجود انسانیت کی اس ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کے لیے اس کی نگاہ اگر کسی کی طرف اٹھتی ہو تو وہ اپنی تمام خامیوں کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ''مدرسہ'' ہی ہو، آیئے دیکھئے، آج سے ستر اسّی سال قبل ڈاکٹر محمد اقبالؒ جیسی مغرب ومشرق کے احوال سے واقف اور دونوں نظامہائے حیات کا تجربہ رکھنے والی شخصیت نے ان دینی مدرسوں کو کس امید بھری نظر سے دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدرسوں میں پڑھنے دو، کیوں کہ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء کے نشانات کے سوا، اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے اثرات کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی مدد بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ''ندوہ'' علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔'' (اقبال نامہ، ج:۱، ص:۱۶۸)

ہندوستان جیسے ملک میں مدرسوں کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ ملک قوموں اور تہذیبوں کا مدفن ہے، یہاں جو قوم آئی وہ ضم ہوگئی، جو تہذیب آئی وہ مٹ گئی، اگر مدرسوں کا یہ نظام ہمارے بڑوں نے نہ چلایا ہوتا تو شاید اب تک ہم بھی اپنی شناخت کھو چکے ہوتے اور اپنی خصوصیات اور تشخصات سے دست بردار ہوکر یہاں کی تہذیب وثقافت اپنا چکے ہوتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس ارباب اقتدار کی نظروں میں کانٹا بن کر چبھے ہیں، ہمیں ہمدردی کے پردوں میں چھپے ان کے ارادوں کو بھی سمجھنا چاہیے، لیکن وقت کے تقاضوں سے آنکھیں موندھ لینا اور موجودہ دور کی ترقیات سے کچھ فائدہ نہ اٹھانا کوئی دانشمندی نہیں، چنانچہ ہمیں اپنے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اور اپنی مذہبی وملی ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھتے ہوئے تبدیلیوں پر غور کرنا چاہیے، ورنہ خطرہ اس بات کا ہے کہ مدارس اپنی افادیت کھو بیٹھیں اور اس کے فارغین اپنی ضرورت تو پوری کرنے میں کامیاب ہوجائیں لیکن اپنے مذہب اور اپنی قوم کی ضروریات پوری کرنے کے لائق نہ رہیں۔

چلتے چلتے مدارس پر کیے گئے ایک نامناسب تبصرہ پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ کا جواب بھی سنیے!

''مدارس ملک میں تعلیم کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہیں اور سماج کے محروم اور پسماندہ طبقات کے تعلیمی فروغ میں مدارس نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔''

انہوں نے کہا کہ ''مدارس کے اساتذہ اور طلباء نے ہمیشہ بلند کردار اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ ہمیشہ کسی بھی قسم کے اسکینڈل سے دور رہے ہیں اور اس تناظر میں ان کے خلاف کسی بھی قسم کی الزام تراشی غیر اخلاقی ونامناسب ہے۔''

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

عزت کا اصل معیار:

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (بلاشبہ اللہ کے یہاں تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا پرہیزگار ہو)

اس آیت سے یہ بات صاف ہوگئی کہ کوئی خاندان معزز نہیں، کوئی منصب والا معزز نہیں، کوئی دولت والا معزز نہیں، کسی کو دنیا کی ساری سہولتیں حاصل ہوں وہ معزز نہیں، کوئی ہوا میں اڑے وہ معزز نہیں، کوئی سمندوں میں چلے وہ معزز نہیں، کوئی چمتکار دکھائے وہ معزز نہیں، کوئی طرح طرح کی کرامتوں کا اظہار کرے وہ معزز نہیں، جب تک کہ آدمی کی زندگی کے اندر تقویٰ کا معیار نہ ہو، گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے عزت کا اصل معیار تقویٰ کو قرار دیا ہے۔

حدیث میں بھی یہی آتا ہے کہ اصل فضیلت وعزت کا معیار تقویٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ ایک بنیادی صفت ہے، ورنہ عزت کا اصل معیار کسی دوسری صفت کو بھی قرار دیا جاسکتا تھا مثلاً آیت میں صبر کا ذکر آجاتا، زہد کا ذکر آجاتا یا اور بہت ساری دوسری جو ظاہری وباطنی صفات ہیں، ان کا ذکر آجاتا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے تقویٰ کے علاوہ کسی صفت کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے کہ تقویٰ وہ صفت ہے جو تمام صفات کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

تقویٰ کا عموم:

تقویٰ کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے اندر ظاہری اعمال اور باطنی کیفیات دونوں شامل ہیں، تقویٰ صرف ظاہری اعمال کا نام نہیں ہے، چاہے کوئی کیسی ہی باطنی کیفیات رکھتا ہو اور اس کو لگتا ہو کہ وہ جنت میں پہنچ گیا، یا اسے لگتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقاتیں کر رہا ہے۔ یاد رکھیں! جب تک کہ ظاہری طور پر اس کی زندگی شریعت کے مطابق نہیں ہوگی، وہ نمازوں کا اہتمام نہیں کرے گا اور سنتوں کا اہتمام نہیں کرے گا، زکوٰۃ وحج اور روزہ وفرائض اور واجبات کا اہتمام نہیں کرے گا تو اس وقت تک وہ متقی نہیں ہوسکتا۔

اس سلسلہ میں بعض مرتبہ بڑی غلط فہمیاں ہوتی ہیں، بعض لوگوں سے کہا گیا کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نماز حرم میں پڑھتے ہیں، پھر مزید پوچھنے پر بتایا کہ ہماری روح حرم میں نماز پڑھتی ہے۔ ظاہر ہے یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ سے شیطان انسان کو دھوکہ میں ڈالتا ہے۔

توجہ طلب بات:

تکیہ شاہ علم اللہ کے قریب ہی ندی کی دوسری طرف ایک چھوٹا تکیہ ہے، جہاں شاہ عبد الشکور صاحب مجذوبؒ رہتے تھے۔ وہ مجذوب تھے اور مجذوب پاگل ہوتا ہے، بس فرق یہ ہے کہ جو دنیا کے لیے پاگل ہو وہ مجنون ہے اور جو اللہ کے لیے یعنی اللہ کا ذکر کرتے کرتے پاگل ہو وہ مجذوب ہے، بعض مرتبہ اگر آدمی کسی کی سرپرستی میں ذکر نہیں کرتا ہے تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دماغ میں گرمی چڑھ جاتی ہے، پھر بس اللہ ہی اللہ یاد رہ جاتا ہے اور دماغ کام نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ شاہ عبد الشکور صاحب بھی ایسے ہی مجذوب تھے، مگر اللہ والے تھے اور اللہ اللہ کرتے کرتے ان کا دماغ چل گیا تھا۔ حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ روزانہ صبح وہاں ٹہلنے جاتے تھے، تو دیکھتے تھے کہ ایک صاحب برہنہ ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ جب شاہ صاحب کو انہوں نے دیکھا تو جلدی سے چٹائی لپیٹ لی اور کہنے لگے کہ ''اوہو! منئی آوت ہے، منئی آوت ہے۔'' یعنی انسان آرہا ہے۔ گویا اس سے پہلے ان کی نظر میں کوئی انسان نہ تھا۔ غرض کہ ان کی ایک عجیب کیفیت تھی، ان کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے، ایک مرتبہ شاہ علم اللہ صاحبؒ نے ان کے پاس اپنا ایک آدمی بھیجا کہ ان سے جا کر کہو کہ نماز پڑھا کریں اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ یہ جواب دیں کہ میری روح نماز پڑھتی ہے، تو کہنا کہ جس طرح روح پر نماز فرض ہے، اسی طرح جسم پر بھی نماز فرض ہے۔ جب وہ

آدمی ان کے پاس گیا اور جا کر کہا کہ آپ نماز پڑھا کیجیے، تو وہ کہنے لگے کہ میری روح حرم میں نماز پڑھتی ہے، تو انہوں نے کہا کہ جس طرح نماز روح پر فرض ہے، اسی طرح جسم پر بھی فرض ہے۔ یہ سن کر وہ کہنے لگے: یہ تم نہیں کہہ سکتے ہو، تو اس نے بتایا کہ شاہ صاحب نے کہلوایا ہے، تو کہنے لگے کہ ارے وہ نہ کہیں تو کون کہیں، پھر یہی جملہ دہراتے رہے اور اسی میں مست ہو گئے۔

اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ پیر بنے بیٹھے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے، بولتے ہیں کہ ہم مدینہ میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بہت مکار اور فریبی وجھوٹے ہوتے ہیں، جو دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نماز ہر چیز پر فرض ہے۔ روح پر، جسم پر، عقل پر اور جسم کے ہر حصہ پر فرض ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے کار کی بات ہے کہ ہماری روح نماز پڑھ لیتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ تقویٰ صرف اندر کی کیفیت بھی نہیں اور تقویٰ صرف ظاہری اعمال بھی نہیں۔ جب تک کہ مکمل زندگی شریعت کے سانچے میں اس طرح نہ ڈھل جائے کہ وہ چیزیں اندر اتر جائیں اور اس کی کیفیات اندر آنے لگیں۔ آدمی کے اندر اخلاص آجائے، وہ جو عمل کرے تو اللہ کے لیے کرنے لگے، یہ اصل تقویٰ کی بات ہے۔

متقی ہونے کا بنیادی ذریعہ:

تقویٰ جس کے اندر جتنا زیادہ ہوگا، اللہ کے نزدیک وہ اتنا ہی زیادہ متقی ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آدمی صرف نوافل سے متقی نہیں ہوتا، بلکہ اصل فرائض ہیں اور قرب بالفرائض ہی اصل ہے۔ حدیث میں صاف صاف آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بندہ فرائض کو اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد نوافل کی کثرت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے، اللہ فرماتا ہے کہ پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس بات کا مطلب یہی ہے کہ بندے کے سارے اعمال اللہ کی عین مرضی کے مطابق ہونے لگتے ہیں، یعنی پھر وہ کوئی کام غلط کرتا ہی نہیں، لیکن یہ تب ہوتا ہے، جب ترتیب صحیح ہوتی ہے، پہلے فرائض، پھر واجبات اور ان کا اہتمام اور اس کے بعد حقوق کی ادائیگی کا اہتمام، ایک حبہ بھی اگر کسی کا باقی رہ گیا تو اس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو اسی بات کی ہدایت کی تھی کہ اگر ایک حبہ بھی کسی کا تمہارے ذمہ باقی ہے تو تمہارے سارے منازل وسلوک دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور تم آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لیے پہلے جس کا جو حق تمہارے ذمہ ہو وہ ادا کرو۔

ان بنیادی باتوں کا تعلق ہماری ظاہری زندگی سے ہے، ان کے بغیر آدمی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سب سے پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ اکل حلال کا اہتمام ہو، ہر ایک کے حق کی ادائیگی کی فکر ہو، جس میں سب سے بڑھ کر اللہ کا حق ہے، اس کے بعد بندوں کے حق کی ادائیگی کی فکر ہو، پھر ان تمام چیزوں کے ساتھ باطنی کیفیات بھی ہوں۔ جب یہ ساری چیزیں ہوں گی تب تقویٰ حاصل ہوگا۔

کیفیات کے مراتب:

تقویٰ کے مراتب ہیں اور مراتب میں بھی اس کی کیفیات کے مراتب ہیں۔ ایک آدمی کے اندر جو کیفیات ہوتی ہیں، دوسرے آدمی کے اندر وہی کیفیات اور اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں، تیسرے کے اندر اور اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی عقل بھی کام دیتی ہے۔ ایک حدیث میں اس طرح کے الفاظ بھی آتے ہیں کہ بعض مرتبہ آدمی عقل سے بہت آگے چلا جاتا ہے۔ عقل سے اس طرح آگے چلا جاتا ہے کہ جیسے ایک شخص ایک کام کرتا ہے اور اس میں ایک نیت کرتا ہے، لیکن دوسرا آدمی وہی کام کرتا ہے، مگر اس میں دس نیتیں کرتا ہے، گویا عقل اس کا ساتھ دیتی ہے کہ ہاں! اس میں یہ بھی دینی فائدہ ہے، اس میں یہ بھی دینی فائدہ ہے۔ مثلاً: ہم فلاں کی عیادت کرنے کے لیے جا رہے ہیں، اب وہ ہمارا پڑوسی بھی ہے، تو ایسے میں عیادت کا ثواب اپنی جگہ پر، اس بے شک کی بڑی فضیلت ہے، لیکن حدیث میں پڑوسی کے متعلق بھی حکم ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، اسی طرح پھر یہ بھی یاد آیا کہ وہ تو ہمارا رشتہ دار بھی ہے اور رشتہ دار کے ساتھ سلوک کا بھی حکم ہے، تو اب حسن سلوک کی بھی نیت کر لی، گویا ایک ہی عمل کے اندر کئی چیزوں کی نیت کر کے ایک مختصر عمل پر زیادہ ثواب کے مستحق بن گئے۔

طلاق کے چند مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

کنائی طلاق:

صریح طلاق کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ایسے الفاظ سے طلاق دینے کو کہتے ہیں جو طلاق دینے کے لیے مخصوص ہوں اور اگر ایسے الفاظ سے طلاق دی جن سے طلاق کے معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں اور کوئی دوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہے تو ان کو طلاق کے کنائی الفاظ کہا جائے گا، جیسے کوئی اپنی بیوی سے کہے کہ

''تم مجھ سے پردہ کرلو''

اب اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے تم کو طلاق دے دی ہے، لہٰذا اب تم میری بیوی نہیں ہو، میں تمہارے لیے اجنبی بن چکا ہوں، اس لیے اب تم مجھ سے پردہ کرو اور کسی اور مقصد سے بھی پردہ کرنے کی بات ہوسکتی ہے۔ اب اگر اس لفظ سے شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو یا کوئی قرینہ اس کا پایا جاتا ہو کہ اس کی مراد طلاق ہے تو اس سے بائن طلاق پڑ جائے گی ورنہ نہیں پڑے گی۔

(معجم الوسیط، شامی: ۲/۵۰۱)

طلاق کنائی کا حکم:

طلاق کنائی کا حکم جاننے سے پہلے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ طلاق کنائی کے الفاظ تین طرح ہوتے ہیں اور طلاق دینے والے کے حالات بھی تین طرح کے ہوتے ہیں۔

کنائی طلاق کے الفاظ کی قسمیں:

جن کنائی الفاظ سے طلاق دی جاتی ہے، وہ تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱- کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے طلاق کے معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں اور ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا، لیکن شوہر ان الفاظ کے ذریعہ اس کے مطالبہ کو ٹھکرا رہا ہے مثلاً: بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں شوہر کہہ رہا ہے کہ

''نکل جا، چلی جا، اٹھ جا، نقاب پہن لے، پردہ کرلے۔''

آپ غور کریں تو بالکل صاف ہے کہ ان الفاظ سے طلاق بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے مطالبہ کو ٹھکرا رہا ہو۔

۲- اور کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن سے صرف طلاق کے معنی مراد ہوسکتے ہیں، لیکن طلاق کے مطالبہ کو ٹھکرانے کا مفہوم ان سے نہیں ہوسکتا جیسے کہے کہ تم مجھ پر حرام ہو، یا میں نے تم کو اپنے سے الگ کردیا۔

۳- اور کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے طلاق کے مطالبہ پر طلاق دینا بھی مراد ہوسکتا ہے اور عورت کو برا بھلا کہنا اور طعن وتشنیع کرنا بھی مراد ہوسکتا ہے، جیسے کہا کہ تو خالی ہے، یا کہا کہ تو کھوکھلی ہے وغیرہ۔

اور انسان کی تین حالتیں ہوتی ہیں:

۱- اعتدال والی نارمل حالت۔

۲- غصہ کی حالت۔

۳- طلاق کی بات چیت کی حالت۔

تو جب انسان نارمل حالت میں ہو، نہ غصہ ہو، نہ طلاق کی بات چیت ہو رہی ہو، نہ بیوی کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کیا جارہا ہو، تو ایسی صورت میں تینوں قسم کے الفاظ میں سے چاہے جن الفاظ کو استعمال کیا ہو، شوہر کی نیت کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کی بات مان لی جائے گی، اگر وہ کہے کہ میں نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے کہے ہیں

تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر کہے کہ میرا ارادہ طلاق دینے کا نہیں تھا، تو اس کی بات مان لی جائے گی اور طلاق واقع نہ ہوگی۔

(ہدایہ مع الفتح: ۳/۴۰۰-۴۰۲، شرح العنایہ علی ہامش فتح القدیر، شامی: ۲/۵۰۳-۵۰۵)

اور اگر شوہر غصہ کی حالت میں ہو تو جن الفاظ سے صرف طلاق مراد لی جاسکتی ہو، عورت کے مطالبہ کو ٹھکرانے یا اس کو برا بھلا کہنے کا ان میں احتمال نہ ہو جیسے کہے کہ عدت گذارو تو خواہ طلاق کی نیت ہو یا نہ ہو قضاءً طلاق واقع ہوجائے گی اور دیانۃً طلاق اسی وقت واقع ہوگی، جب طلاق کی نیت ہو۔ (مصادر مذکورہ)

اور جب طلاق کی بات چیت کی حالت ہو، عورت طلاق کا مطالبہ کر رہی ہو تو قضاء میں ان الفاظ سے طلاق واقع ہوجائے گی، جو عورت کے مطالبہ کے ٹھکرانے کے بجائے طلاق دینے کے مفہوم میں آتے ہیں، جیسے کہے کہ تم مجھ سے جدا ہو، خالی ہو وغیرہ۔ اس لیے کہ جب ان الفاظ کو طلاق کے مطالبہ پر کہا ہے تو بظاہر اس کی مراد طلاق دینا ہی ہے، لیکن دیانۃً ان سے بھی طلاق اسی وقت واقع ہوگی جب طلاق کی نیت سے ان الفاظ کو ادا کیا ہو۔ (مصادر مذکورہ)

وہ کنائی الفاظ جن سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے:

تین کنائی الفاظ ایسے ہیں جن سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، اس لیے کہ ان میں لفظ طلاق پوشیدہ ہوتا ہے وہ تین الفاظ ہیں:

"اعتدی" (عدت گذارلو)

"استبرئی رحمك" (اپنے رحم کی صفائی کرلو)

"أنت واحدة" (تمہیں ایک ہے)

چونکہ ان تینوں الفاظ میں صریح طلاق پوشیدہ ہوتی ہے، لہٰذا ان سے صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔

رہے بقیہ کنائی الفاظ تو ان تمام سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، اگر ایک یا دو کی نیت کرے تو ایک بائنہ طلاق واقع ہوتی ہے اور اگر تین کی نیت کرے تو تین طلاق واقع ہوکر مغلظہ طلاق ہوجاتی ہے۔

(ہدایہ مع الفتح: ۳/۳۹۸-۴۰۰)

کچھ ایسے الفاظ جن سے طلاق بائنہ واقع ہوجاتی ہے:

کنائی الفاظ میں سے مندرجہ ذیل الفاظ بھی ہیں:

۱- بیوی سے کہے کہ:

"دوسرا شوہر تلاش کرلے۔"

۲- بیوی سے کہا کہ:

"میں تیرا شوہر نہیں ہوں۔"

۳- بیوی نے شوہر سے کہا کہ:

"تو میرا شوہر نہیں ہے۔" اور شوہر اس کی تصدیق کرے۔

۴- شوہر نے بیوی سے کہا کہ:

"میں تم کو اپنی بیوی نہیں سمجھتا، یا تو میری بیوی نہیں ہے۔"

۵- بیوی سے کہا کہ: "میں نے نکاح ختم کردیا۔"

۶- بیوی سے کہا کہ: "جا شادی کرلے۔"

تو مندرجہ بالا الفاظ اگر طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔ اگر ایک یا دو کی نیت کی تو ایک طلاق واقع ہوگی اور اگر تین طلاق کی نیت کی تو تین طلاقیں واقع ہوکر مغلظہ ہوجائے گی۔

(ہدایہ مع الفتح: ۳/۳۹۹-۴۰۰، ہندیہ: ۱/۳۷۵)

طلاق بائن میں رجوع نہیں ہوسکتا:

اگر کسی نے بیوی کو ایسے الفاظ سے طلاق دی جن سے طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے۔

مثلاً: کنائی الفاظ سے طلاق دی (ان تین الفاظ کے علاوہ سے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) یا غیر مدخول بہا عورت کو صریح یا کنائی لفظ سے طلاق دی، یا عورت کو کسی عوض کے بدلہ میں طلاق دی، تو اس سے رجوع کرنا جائز نہیں ہوتا، لیکن عورت اگر راضی ہو تو نئے مہر سے عدت کے دوران یا عدت کے بعد اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔

(ہندیہ: ۱/۴۷۲-۴۷۳)

کتمان آیات کا وبال

عبدالسبحان ناخداندوی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾(البقرة: ۱۷٤) (بے شک جولوگ چھپاتے ہیں جسے اللہ نے کتاب میں اتارا اور اس کے بدلہ معمولی قیمت کا سودا کرتے ہیں، ایسے لوگ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے اور اللہ قیامت میں ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک وصاف کرے گا، ان سب کے لیے دردناک عذاب ہے)

اس آیت میں پیٹ کے وہ پجاری مراد ہیں جو محض پیٹ بھرنے کی خواہش میں اللہ کی آیات کو چھپاتے ہیں، غلط احکام بتا کر رشوت لیتے ہیں اور اپنے پیٹ کا جہنم بھرتے ہیں۔ مرنے کے بعد یہ حریص جب دربار الٰہی میں حاضر ہوں گے تو ان کو اس گندگی سے پاک نہیں کیا جائے گا، نہ اللہ رب العزت ان سے بات کرنا چاہے گا، دردناک عذاب ان کا مقدر ہوگا۔

اللہ کی کتاب کو چھپا کر غلط احکام بتا کر پیسے کمانا اللہ کی توہین کرنا ہے اور یہ شدید جرم ہے جس سے کمائی ہوئی آمدنی حرام محض ہے اور ایسا کام کرنا کفر ہے۔ اگر مجبوری کے عالم میں حرام کھانے کی ضرورت پڑ ہی جائے تب بھی کراہت کے ساتھ کھانے کا حکم ہے اور یہاں مکروہ ترین عمل (اللہ کی آیات چھپانے) کو صرف حرام کھانے کی غرض سے پسندیدہ بنایا جارہا ہے، گویا یہ کہا جارہا ہے کہ ہم اپنی حرام کردہ چیز کو مجبوری کی وجہ سے جائز کرتے ہیں، تب بھی دل میں کراہت محسوس کرنے کی تلقین کرتے ہیں، جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ شدید ترین حرام کام کو محض پیٹ کی جہنم بھرنے کے لیے برضا ورغبت جائز سمجھ رہے ہو، غور کرو تم کس قدر دردناک عذاب کو اپنے اوپر مسلط کررہے ہو۔

ثمناً قلیلاً؛ سے یہ معلوم ہوا کہ کتاب الٰہی وہ انمول تحفہ ہے کہ اس کے بدلہ پوری دنیا مل جائے تو وہ "ثمن قلیل" ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ واقعی تھوڑی سی قیمت پر کتاب الٰہی کی آیات کا سودا کرنے پر تیار ہیں۔

ما یأکلون فی بطونهم إلا النار؛ بلیغ ترین تشبیہ ہے، اللہ کے احکام چھپا کر اس سے کھلواڑ کر کے پیسے وصولنا اور لقمہ تر مزے لے لے کر اپنے پیٹ میں اتارنا درحقیقت جہنم کے انگاروں سے اپنے پیٹ کے برتن کو بھرنا ہے۔

رشوت کا بازار گرم کر کے یہود و نصاریٰ کے مشائخ علماء اور عوام کتاب الٰہی کو بیچ بیچ کھا رہے تھے۔

ولا یکلمهم اللّٰه؛ اللہ ان سے بات تک نہیں کرے گا، اللہ کی کتاب جو اللہ سے بات کرنے کا سب سے پاکیزہ ذریعہ تھی، اسی کو چھپالیا، گویا اللہ کا کلام چھپایا تو پھر وہ خود قابل کلام کیسے رہ سکتے تھے۔

بات نہ کرنا انتہائی ناراضگی کی دلیل ہے، "فلاں فلاں سے بولتا نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شدید ناراض ہے، بات تک کرنے کا روادار نہیں، اللہ تعالیٰ جہنمیوں سے فرمائے گا:

﴿اخْسَؤُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾

(اسی میں ذلیل وخوار پڑے رہو مجھ سے بولو نہیں۔)

ولا یزکیھم؛ یہ معاف نہ کرنے کی تعبیر ہے، یعنی ان کی نجاست ان ہی سے چپکی رہے گی، اسی سمیت وہ جہنم رسید ہوں گے، گناہ کو معاف کرکے ان کو پاکیزہ نہیں بنایا جائے گا، جنہوں نے کتاب الٰہی جیسی مقدس اور پاکیزہ کتاب کو اپنی خواہشات سے آلودہ کیا ان کی آلودگی کیوں دور کی جائے گی، جو کافر ہیں وہ تو ہمیشہ کی گندگی میں پھینک دیے جائیں گے:

﴿لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ﴾

(اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ناپاک کو پاک سے الگ کرے گا اور ناپاک کو ایک کے اوپر ایک لادتے ہوئے ان کا پورا ڈھیر بنائے گا پھر اسے جہنم میں جھونک دے گا۔)

کوئی اللہ کا نام لیوا اس طرح کا کام کرے تو اسے بھی اپنے گندے کام سمیت جہنم میں پھینکا جائے گا، یہاں تک عذاب الٰہی سے اس کی صفائی ہوجائے اور وہ جنت میں داخل کردیا جائے۔

ولھم عذاب أليم؛ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، کافر کے لیے لامتناہی اور مؤمن کے لیے متناہی، یہ سزا صرف یہود ہی کے لیے نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر کلام الٰہی کو چھپا کر پیسے لینے کا گھناؤنا کاروبار شروع کریں تو ان کو بھی یہود ہی کی طرح جہنم رسید کیا جائے گا۔ سزا کتنی لمبی ہوگی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

فی بطونھم؛ کا لفظ معنی خیز ہے، حد سے زیادہ کھانے پینے اور مال کمانے کی حرص انسان کو بہت گراتی ہے، پھر یہی حرص اسے بڑے سے بڑا جرم کرنے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتی، اسی طرح پیٹ بھرنے کی خواہش بسا اوقات رذیل سے رذیل ترین کام کو بھی اچھا بنا کر دکھاتی ہے، آدمی محض بے غیرت بن کر رہ جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن نہ بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا، نہ ان کی طرف نگاہ فرمائے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، زنا کار بڈھا، جھوٹا بادشاہ، متکبر فقیر۔ کسی تقاضے سے گناہ کرنا بھی حرام ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے گناہ کرنا اور بدترین بات ہے، یہاں ایسا ہی ہے، بڑھاپے میں منفی خواہشیں لگ بھگ سرد پڑ جاتی ہیں، لیکن یہ بڈھا ایسا خبیث ہے کہ بڑھاپے میں بھی اس لعنت کا شکار ہے، بادشاہ طاقتور ہوتا ہے، کمزور اپنی پناہ کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، حالانکہ یہ بھی غلط ہے، لیکن یہ بیہودہ بادشاہ ہوکر بھی جھوٹ بولتا ہے، اس لیے یہ بڑا مجرم ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (البقرۃ: ۱۷۵) (یہ وہ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ اور عذاب کو مغفرت کے بدلہ خرید لیا، تو یہ آگ (کو برداشت کرنے) پر کس قدر ڈھیٹ ہیں۔)

اصول یہ ہے کہ پسندیدہ چیز خریدی جاتی ہے اور کم پسندیدہ چیز کو بیچا جاتا ہے، اللہ کی کتاب ہدایت ہے یعنی صحیح راستہ بتا کر منزل مقصود تک پہنچاتی ہے، اس کا نتیجہ مغفرت ہے، کتاب الٰہی سے انحراف کرنا چاہے کتمان کی شکل میں ہو یا تحریف کی، بے اعتقادی کی صورت میں ہو یا بے عملی کی، یہ حقیقت میں راستے کو کھو کر منزل سے بھٹک جانا ہے، اس کا نتیجہ عذاب ہے، یہ لوگ احمق تھے جنہوں نے اللہ کی ہدایت کو ٹھکرا کر گمراہی مول لی، مغفرت کے اسباب کو چھوڑ کر عذاب کے پھندے میں اپنی گردن پھنسالی۔

فما أصبرھم علی النار؛ یہ کلمہ تعریف نہیں ہے، ان کے صبر اور جرأت کی داد نہیں دی جارہی ہے، ان کی بے ہودگی اور حماقت پر طنز ہے، جہنم میں گرنے کو بے تاب ہیں، آگ کے عذاب پر کیا قوت برداشت دکھا رہے ہیں، لیکن جب عذاب آئے گا تو اس کا ایک جھٹکا ہی ساری اکڑ ہر ہر متکبر سے نکال باہر کرے گا۔

آزادیٔ ہند-حقیقت یا سراب؟

مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی

ہمارا عزیز وطن ہندوستان مختلف ادیان و مذاہب اور گوناگوں تہذیبوں اور مختلف رنگ و نسل کے باشندوں کے آپسی بھائی چارہ و یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے، ملک ہندوستان کا یہ امتیاز ہے کہ یہاں ہر مذہب اور تہذیب کے ماننے والے آپسی اتحاد و اتفاق اور آپسی میل ملاپ اور محبت سے رہتے آئے ہیں، یہاں عجب رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے، جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے گی اور آپسی اتحاد و اتفاق، محبت و یگانگت ملک ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں بھی نظر آیا، جہاں مسلمانوں نے اس ملک کے لیے اپنی جان مال کی قربانی دی، وہیں اہل وطن نے بھی ملک آزاد کرانے میں حصہ لیا۔

حقیقت میں آزادی کا بگل شہادت کے متوالے مسلمان اور مجاہد علماء کرام نے بجایا اور شروع سے آخر تک انگریزوں سے نبرد آزما رہے، وہ چاہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہوں یا ان کے فرزند شاہ عبد العزیز دہلوی ہوں، جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا، وہ چاہے حضرت سید احمد شہیدؒ ہوں یا شاہ اسماعیل شہیدؒ ہوں، سب کی دلی تمنا اور آرزو یہ تھی کہ غاصب انگریز کو ملک بدر کیا جائے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ایک زبردست تحریک چلائی اور جنگی تیاری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور سب سے پہلے رنجیت سنگھ اور اس کی فوج سے مقابلہ کیا، جو کھل کے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن بعض غداروں کی وجہ سے سید صاحب کی تحریک کامیاب نہ ہوسکی اور اپنے رفقاء کے ساتھ بالاکوٹ کی پہاڑی پر جام شہادت نوش فرمایا، سید صاحب ہی کے بعض رفقاء تھے جنہوں نے اس چنگاری کو بجھنے نہ دیا اور اپنے سینے میں جہاد کا شوق لیے آگے بڑھتے رہے، بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ سید صاحب کی تحریک سکھوں کے خلاف تھی، دراصل سکھوں کو شکست دے کر سید صاحب انگریزوں کو ملک سے کھدیڑنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتے تھے اور یہی اصل ہدف تھا، یہی تحریک تھی جس کے سایہ تلے بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں اور بڑے بڑے علماء اس میں شریک ہوئے، جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جن کے خلاف گرفتاری وارنٹ تھا، اسی طرح مولانا قاسم نانوتوی، حافظ ضامن شہید، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہم اللہ، ان کے علاوہ ہزاروں علماء ہیں جن کے نام تاریخ کے صفحات میں موجود ان کے مجاہدانہ اور سرفروشانہ عظمت و شان اور کارہائے نمایاں کا پتہ دیتے ہیں اور ہزاروں وہ ہیں جن کے نام اس ملک کی مٹی میں دفن ہو چکے ہیں، آخر کار ایک طویل جدوجہد کے بعد (جس کی شروعات سنہ ۱۷۰۰ء میں ہوئی اور شیر میسور فتح علی ٹیپو سلطانؒ اور ان کے والد حیدر علی نے انگریزوں کے دانت کھٹے کیے اور اپنوں ہی کے غداری کی وجہ سے ٹیپو سلطان مئی ۱۷۹۹ء میں شہید ہوئے۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ملک انگریزوں سے آزاد ہو گیا، اس کے بعد بھی بہت سے سخت ترین اور دل دہلا دینے والے واقعات

رونما ہوئے، جس کے تصور سے بھی روح کانپ جائے، طوالت کے باعث ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے، بہر حال ملک آزاد ہو گیا۔

موجودہ دور میں ہم لوگ ایک آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں، ایک آزاد ملک میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن کیا ہم حقیقت میں آزاد ہیں، حتی کہ بعض کی زبانی سنا گیا کہ ہم تو غلام ہندوستان میں زیادہ اچھے تھے، اس ملک کو آزاد ہوئے ۷۷ رسال ہو رہے ہیں لیکن آج بھی اس ملک کے باشندے غلامی کے احساس میں جی رہے ہیں، ان کو وہ آزادی نہیں ملی، جس آزادی کا انہوں نے خواب دیکھا تھا، آج بھی یہاں ظلم وستم کا بازار گرم ہے، حکومت کی کرسی پر ایسے لوگ براجمان ہیں جو ملک کو بیچنے کے درپے ہیں، یہ وہی کام کر رہے ہیں جو انگریز کر رہے تھے، یہاں کا غریب مزید غریب ہوتا جا رہا ہے اور امیر کی دولت آسمان سے باتیں کر رہی ہے، ہر جانب معاشی واقتصادی بحران چھایا ہوا ہے، ملک میں اتنی دولت ہونے کے باوجود بڑی تعداد بھوک سے بلک رہی ہے، ان کو دو وقت کا کھانا میسر نہیں ہے، پڑھے لکھے نوجوان مزدوری کرنے پر مجبور ہیں، ایک طبقہ تو سرکاری نوکری کا تصور ہی نہیں کر سکتا، روزگار کا کہیں پتہ نہیں، جو برسر روزگار ہیں ان کا روزگار چھینا جا رہا ہے، کوئی سرکاری کام بغیر رشوت کے نہیں ہو سکتا، دھاندلی عروج پر ہے، الیکشن سے پہلے سیاسی پارٹی وعدوں کے سبز باغ دکھاتی ہے اور پھر اقتدار ملنے کے بعد وہ تمام اعلانات اور وعدے سرد بستے میں ڈال دیے جاتے ہیں، مسلم فریق کے لیے تو وعدوں کی فہرست میں ایک وعدہ بھی نہیں ہوتا۔

یہی ہمارا جمہوری ملک ہے، اسی کو جمہوریت کہتے ہیں، یہاں ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر حکومت چل رہی ہے، عدل و انصاف ناپید ہو چکا ہے، حق اور ناحق میں کوئی تمیز نہیں، حکومت وحشی جانور اور بھیڑیے کے مانند ہے، دلوں میں رحم کا کوئی مادہ نہیں، تنہا شخص کو ایک بھیڑ ہلاک کر دیتی ہے، ان کے خلاف نہ کوئی کارروائی اور نہ کوئی تنبیہ، مزید پھولوں کے ہار سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے، زانی اگر حکومت کا فرد ہے یا ایک خاص طبقہ سے ہے تو خاموشی سے اس کو ضمانت دے دی جاتی ہے، یا کہا جاتا ہے کہ خواتین گھر سے باہر کیوں نکلتی ہیں، مرد تو مرد ہے، وہ کیا کرے بیچارہ، عبادت گاہوں کو بغیر کسی نوٹس کے منہدم کر دیا جاتا ہے، تعلیم سے ان کو نفرت ہے، مدارس کیا اسکولوں کو بند کر دیا جاتا ہے، اس ملک میں ۸۰۰ رسال مسلمانوں نے حکومت کی ہے، شاید ہی کوئی ایک واقعہ ہو کہ کسی مسلم بادشاہ نے غیر مسلموں پر ظلم وزیادتی کی ہو، ان کو عبادت گاہوں سے روکا ہو یا ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا گیا ہو، کوئی ایک مثال بھی آپ کو نہیں ملے گی، بلکہ غیر مسلم مسلم حکومت میں سب سے زیادہ خوشحال تھے، لیکن اس تصویر کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ نفرتیں انتہا کو پہنچ جائیں اور حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، یہاں کی عدالتیں بھی ایسی اندھ بھکتی کی مثال بن چکی ہیں کہ اگر اکثریت کے خلاف تمام ثبوت اور گواہیاں موجود ہیں، اس کے باوجود کمزور اور اقلیت کے خلاف فیصلہ کر دیا جاتا ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہے، ظلم و بربریت کی انتہا ہے، شاید اس کا تصور انگریز حکومت میں نہ ہو، مزید حکمران وہی پالیسی اپناتے نظر آتے ہیں، جس پالیسی اور حکمت عملی کو انگریزوں نے اپنایا تھا، divide and rule یعنی پھوٹ ڈالو حکومت کرو، اسی حکمت عملی کو ہتھیار بنا کر اپنی حکومت چمکانے میں لگے ہیں، وہ آپسی بھائی چارہ، الفت ومحبت، ایک دوسرے کا تعاون کرنا، گنگا جمنی تہذیب کی تمام شکلیں ایک خواب معلوم ہوتی ہیں۔

یہ آزادی ہی سراب معلوم ہوتی ہے، ہم خود فیصلہ کریں کہ کیا ہم حقیقت میں آزاد ہیں یا یہ ایک سراب ہے؟!

آزادیٔ ہند-ایک لمحہ فکریہ

محمد ارمغان بدایونی ندوی

۱۵/اگست کی تاریخ ملک ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے، یہ وہ دن ہے جس میں ہندوستانی باشندوں کو برٹش گورنمنٹ کی غلامی سے مکمل طور پر آزادی نصیب ہوئی تھی، اسی لیے ہر سال اس تاریخ کو ملک بھر میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ ''یوم آزادی'' منایا جاتا ہے۔ اس دن ملک کے ہر شہری کی زبان پر وطن دوستی کے نغمے ہوتے ہیں اور ملک کی خاطر جان دینے والوں کے لیے بہترین خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ نیز تمام عوامی مقامات پر ترنگا لہرا کر حب الوطنی کے جذبہ کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ حکومتی ایوان ہوں یا سرکاری دفاتر، مدارس ہوں یا اسکول، اسٹیشن ہوں یا بس اڈے، غرض ہر جگہ ہر شہری اس دن کو مناتا ہے اور خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

بے شک ہم پندرہ اگست کو آزاد ہو گئے تھے، بیشک ہمارے آباء واجداد کا خون رنگ لے آیا تھا، بیشک انگریزوں کا تسلط ہمارے اوپر سے اس دن ختم ہو گیا تھا، بے شک ہم کسی باہری طاقت کے دباؤ سے نکل گئے تھے، بے شک ہمیں ظلم وستم کا تختہ مشق بننے سے خلاصی مل گئی تھی، بے شک ہمیں ایک ذہنی وجسمانی تحفظ حاصل ہو گیا تھا، بے شک ہماری جانیں اور جائیدادیں محفوظ ہو گئی تھیں، لیکن.....

لیکن! غور طلب بات یہ ہے کہ اس دن کیا فقط ہمارے جسم آزاد ہوئے تھے یا ہمارا ذہن ودماغ بھی آزاد ہوا تھا؟ اس دن کیا فقط انگریزوں کا اقتدار جسمانی طور پر حکومتی ایوانوں سے خالی ہوا تھا یا ذہنی طور پر بھی ہمارے ایوان پاک ہو گئے تھے؟ اس دن کیا ہم نے انگریزوں کو رخصت کرنے کے ساتھ بھید بھاؤ، نفرت وعداوت اور فرقہ واریت سے بھی آزادی حاصل کی تھی یا نہیں؟ اس دن جبکہ ہم نے خود کو محفوظ تصور کیا تھا' کیا اسی کے ساتھ ہم نے اپنے مذہب وثقافت کو بھی محفوظ سمجھا تھا یا نہیں؟ اس دن جب کہ ہم نے ایک غیر ملکی آمرانہ نظام حکومت کو شکست دی تھی، کیا اپنے ملک میں عدل وانصاف پر مبنی نظام حکومت کی بنیاد رکھی تھی یا نہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہمیں ایک نظام حکومت اور چند ظالمانہ طاقتوں کی بالادستی سے ظاہری طور پر تو آزادی حاصل ہوئی تھی، لیکن وہ مکمل اور حقیقی آزادی نہ تھی اور نہ ہی یہ وہ آزادی ہے جس کا ہمارے مجاہدین آزادی نے خواب دیکھا تھا اور اس کے لیے خون بہایا تھا۔

حقیقی آزادی وہ ہے جس میں ملک کے تمام شہریوں کو مکمل تحفظ کا احساس ہو، ان کی جانیں، ان کی جائیدادیں، ان کے خاندان، ان کا مذہب، ان کی شریعت، ان کی ثقافت، ان کی تہذیب اور ان کی روایات پر کسی قسم کا ڈاکہ پڑنے کا خواب میں بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔ انہیں اپنے مخصوص عقائد ونظریات پر عمل کرنے اور ان کی ترویج واشاعت کی کھلی اجازت ہو، نہ انہیں کچھ بولنے میں حجاب ہو اور نہ کسی چیز پر عمل کرنے کی پابندی ہو۔ وہ تعلیم میں آزاد ہوں، وہ معاشرت میں آزاد ہوں، وہ سفر کرنے میں آزاد ہوں، وہ بازاروں میں آزاد ہوں، وہ اپنے عبادت خانوں میں آزاد ہوں، وہ اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے میں آزاد ہوں، وہ اپنی مذہبی رسومات میں آزاد ہوں۔ نہ انہیں حکمرانوں کی بالادستی کا خوف ہو اور نہ ہی جبریہ قوانین کی دہشت، نہ وہ گرانی کے عذاب سے دوچار ہوں اور نہ بھوک مری کی آفات میں گرفتار۔ غرض کہ ملک کا ہر شہری فارغ البال ہو، آسودہ حال ہو، بے خطر وخیال ہو اور وہ خود کو اور اپنے اہل خانہ کو اپنے گھر سے باہر ملک کے ہر کونے میں اتنا ہی محفوظ تصور کرتا ہو جتنا کہ وہ خود کو اپنے گھر کی چہار دیواری میں محفوظ ومامون سمجھتا ہے۔

قارئین باتمکین!

اگر آزادی کے اس بلیغ مفہوم اور تشریح کے تناظر میں ہم اپنے ملک ہندوستان کے موجودہ حالات کا جائزہ لیں تو ہر ذی شعور شخص یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور حقیقی آزادی سے کس قدر دور ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ آج جو ذہنیت اور جو پالیسی ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہی ہے، اس نے ہماری عقلوں کو مفلوج کر دیا ہے، ہمارے سوچنے کے زاویوں کو تبدیل کر دیا ہے، اسی لیے بعض اوقات ہمیں یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ ہم جس ملک میں سانس لے رہے ہیں' کیا یہ واقعی حقیقی معنی میں ایک آزاد ملک ہے یا نہیں؟

سچی بات یہ ہے کہ سب سے بڑے جمہوری ملک میں کسی ایک فکر ونظریہ کی اشاعت اور اس پر اصرار کرنا، اس کی خاطر فسادات کرانا، نفرت کی سیاست کرنا، فرقہ واریت کو بڑھاوا دینا، بدعنوانی کو فروغ دینا، صنف نازک کے حقوق کو پامال کرنا، ان کی آوازوں کو دبانا، دیگر مذاہب اور کمیونٹیوں کو ان کے مذہبی تشخص سے دست بردار ہونے پر مجبور کرنا، ان کے مذہبی مقامات سے چھیڑ چھاڑ کرنا، مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنا، اقتصادی زبوں حالی سے بے بہرہ ہونا، بے روزگاری کے اضافہ پر مطمئن رہنا، جبریہ ٹیکسوں کے ذریعہ عام آدمی کی زندگی اجیرن کرنا، انصاف کے مندروں پر بالادستی حاصل کرنا، ذرائع ابلاغ پر تسلط جمانا، فوج کی طاقت کو دبانا، محکمہ پولیس کو بے مہار چھوڑنا، عوام میں خوف وہراس کا ماحول بنانا، تعلیم کو مہنگا کرنا، سرکاری محکموں کو مستحکم وچاق وچوبند نہ کرنا، سیاسی لیڈران اور افسران کو کھلی چھوٹ دینا، ان کے ہر عمل پر جواز تلاش کرنا، کسانوں کی سہولیات سلب کرنا، عوام کے خون پسینے کی کمائی کو چوس کر اپنے عیش کرنا، عوام کو خاطر خواہ سہولیات فراہم نہ کرنا، نہ ان کو علاج ومعالجہ کی سہولیات دینا، نہ کم قیمت میں انہیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر کرانا، ملک کی سالمیت اور تعمیر وترقی کے خواب آنکھوں میں نہ سجانا' واقعہ یہ ہے کہ یہ سب ہمارے آزاد ہندوستان کے وہ حقائق ہیں جو اس ملک کی آزادی پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہیں۔

موجودہ حالات کی ابتری کا عالم یہ ہے کہ آج اس ملک کی اقلیتوں کو ثانوی درجہ کا شہری باور کرایا جا رہا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ''مسلمان'' نشانہ پر ہیں، ان کی مساجد ومدارس، ان کی شریعت، ان کا کلچر، ان کی معیشت اور ترقی پر فسطائی طاقتوں کی سب سے زیادہ نظر ہے۔

اس وقت ہم ہندوستانی باشندوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم محض چند بلند وبانگ دعووں پر قناعت کر لیتے ہیں اور سیاسی قائدین کی ملمع سازیوں پر مطمئن ہوجاتے ہیں، حتی کہ بعض اوقات ان کی چرب زبانی سے مسحور ہوکر انہی کو انسانیت کا دیوتا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ شاید ہم اپنا یہ حق ہی نہیں مانتے کہ ایک جمہوری ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے ہمیں یہاں کی قیادت کے احتساب کا پورا استحقاق ہے، بالفرض اگر معدودے چند افراد اپنا یہ فرض سمجھتے بھی ہیں تو پھر ان کی آواز کو اٹھنے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے دبا دیا جاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے نازک موقع پر اس ملک کے دانشوران اور پڑھا لکھا طبقہ میدان میں آئے، وہ اس ملک کے اندر سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کا کام کرے، انسانیت کی صدا لگائے، انسانیت کے فریضہ سے روشناس کرائے، انسانی حقوق کا تعارف کرائے، اس کے ضمیر کو جھنجوڑے، اس کے دل کو ٹٹولے اور انسانیت کی بنیاد پر تمام مذہب کے ماننے والے انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے اور انہیں یہ احساس دلائے کہ اس ملک کی تعمیر وترقی میں ہم سب کی فلاح وبہبود ہے، اگر ہم میں سے کسی ایک مذہب والے کو بھی اپنے محدود ذاتی منافع واغراض کی خاطر کسی جبروتی طاقت نے اپنی ہوا وہوس کا نشانہ بنایا، تو یہ صرف کسی ایک برادری اور کمیونٹی کا نقصان نہ ہوگا بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوگا اور اس کی آزادی پر ایک بہت بڑا داغ لگے گا۔

یہ ملک حقیقی معنی میں اسی وقت آزاد ہوگا جب یہاں کے رہنے والوں کو ہر طرح اپنے پورے مذہبی عقائد وتشخصات کے ساتھ اور آنکھوں میں ترقی کے خواب سجا کر جینے کا حق حاصل ہو۔

حب الوطنی اور مسلمان

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

’’وطن اور سرزمین کی محبت، ماں باپ کی محبت، بھائی بہن کی محبت کی طرح طبعی وفطری ہے اور مذاق انبیاء واولیاء میں رچی ہوئی، وطن سے محبت یوسف علیہ السلام کو تھی، خاتم النبین ﷺ کو تھی، صحابہ رسول رضی اللہ عنہم اجمعین کو تھی، مدینہ آکر مکہ کی یاد مدتوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تڑپاتی رہی۔

لیکن وطن دوستی کی فضیلت کے باوجود شریعت کا سبق وطن پرستی کا نہیں۔ وطن لاکھ عزیز ومحبوب ہو، جب دین ووطن میں آکر تصادم ہوجائے، ایک طرف مصالح وطنی ہوں، دوسری طرف مصالح دینی اور دونوں میں جمع کی کوئی صورت نہ رہے تو رعایت صرف مصالح دینی کی کرنی چاہیے اور وطنیت کو دل پر جبر کرکے سہی ذبح کرکے رکھ دینا چاہیے، وطن کے اوپر تو اس صورت میں جہاد کرنا، چڑھائی کرنا، وطن والوں سے قتال کرنا، لوٹنا، مارنا، جلادینا سب جائز اور بعض صورتوں میں واجب ہوجاتا ہے۔ دین کی خاطر، کلمۃ اللہ کی سربلندی کی خاطر بے شمار صحابہ وطن کو چھوڑ کر حبشہ گئے، مدینہ گئے، انبیاء نے وطن کو چھوڑا، وطن سے ہجرت کی، وطن والوں سے قتال کیا، مارا، کاٹا، خاک وخون میں لٹایا، وطن کی عورتوں کو بیوہ، وطن کے بچوں کو یتیم کیا، محض اس لیے کہ دین الٰہی پھیلے اور وطن والوں کی خبیث عادتیں چھوٹیں۔ اس بڑے مقصد کے سامنے یہ چھوٹے چھوٹے مقاصد چیز ہی کیا ہیں؟

یورپ غریب اگر وطنیت کے بت کی پوجا کررہا ہے تو معذور ہے، اس کے پاس زروزمین سے بلند تر چیز ہی کون سی ہے؟! ہندو اگر اپنی ’’ہندیت‘‘ پر قانع ہیں تو وہ بھی ایک حد تک معذور ہیں، ان بے چاروں کے سامنے اس سے بلند تر، وسیع تر مقصد ہی کون سا ہے؟! لیکن یہ ہماری کون سی شامت ہے کہ کہیں زیادہ بلند وبرتر مقاصد رکھ رکھا کر بھی ہم انہی پست نظر قوموں کی پیروی پر گرے جارہے ہیں! ہمارا فرض تو انہیں پستیوں سے نکال کر بلندیوں پر لانا تھا، نہ یہ کہ الٹے ہم خود ہی ان کی پستیوں پر اترے آرہے ہیں۔ وطن کی مٹی سے محبت تو جانوروں تک کو ہوتی ہے، بلی کو ہوتی ہے، کتے کو ہوتی ہے، یہ طبعی محبت ہے، طبیعت کے موافق ہے، لیکن مقاصد کے ساتھ محبت ایک عقلی محبت ہے، مخصوص بشری امتیاز کی چیز ہے اور عقلی محبت طبعی محبت سے وہی نسبت رکھتی ہے جو آسمان کو زمین کے ساتھ ہے۔ ہجرت کا لب لباب کیا ہے؟ رضائے الٰہی کے لیے ترک وطن وعلائق وطن اور ہجرت کے فضائل کس مسلمان کے کان میں نہیں پڑے ہیں؟!‘‘

(سچی باتیں: ۱۳۵-۱۳۷)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 16 ⚜ August 2024 ⚜ Issue: 08

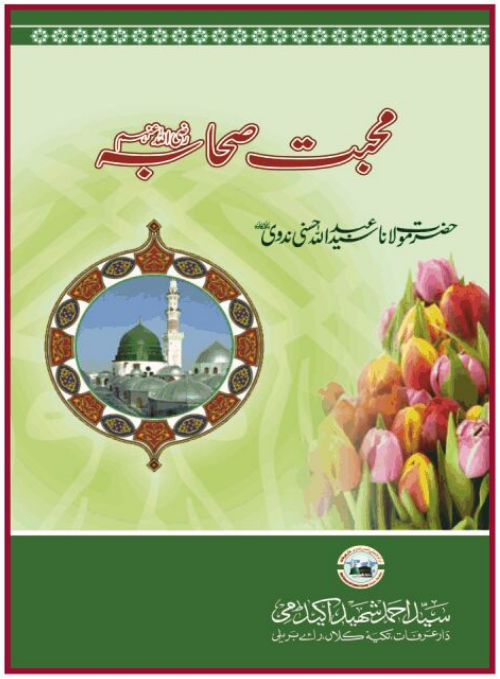

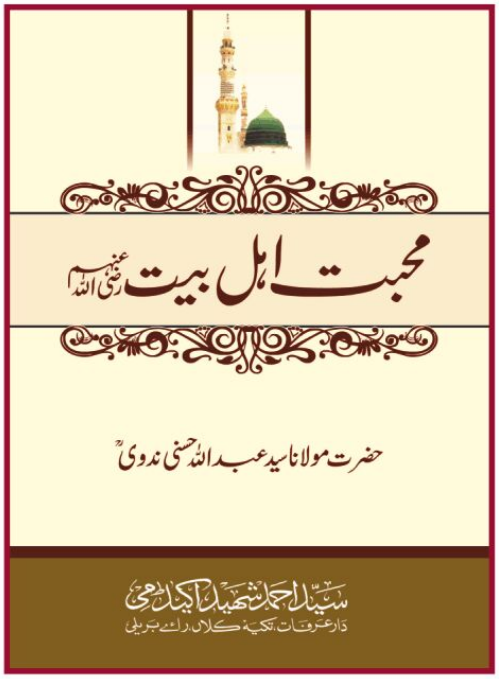

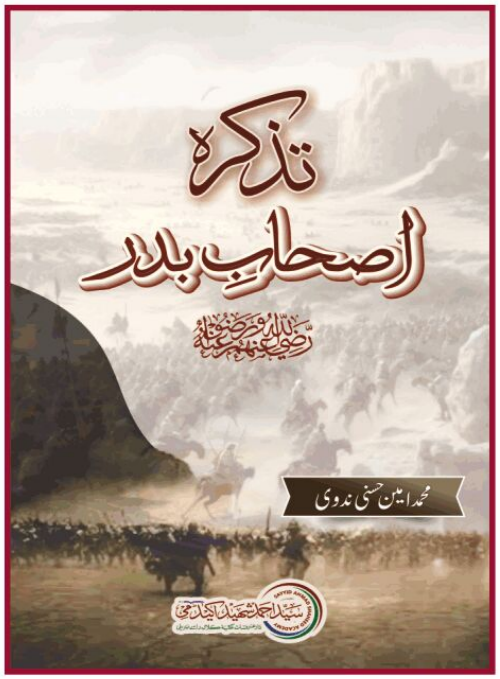

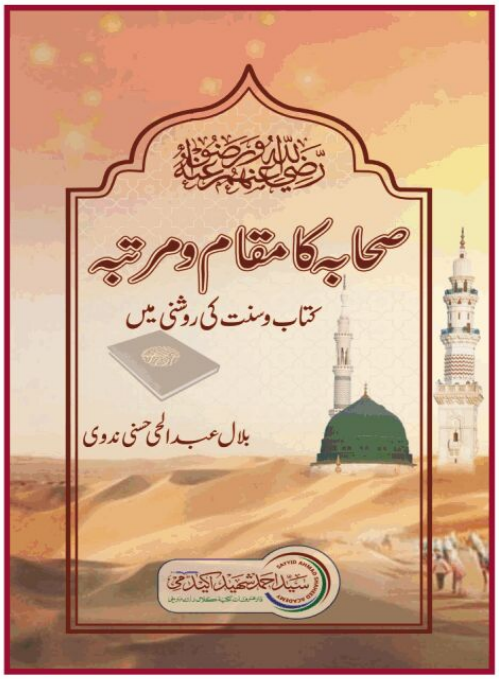

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)